حصہ غزلیات

خواجہ میر درد ـــــ (1719ء-1785ء)

شاعر کا تعارف: سیّد خواجہ میر نام اور درد تخلص تھا۔ والد کا نام خواجہ محمد ناصر اور عندلیب تخلص تھا جو فارسی زبان کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ظاہری و باطنی کمالات اور تعلیم و تربیت اپنے والد ہی سے حاصل کی۔ قرآنِ پاک، حدیث، تفسیر، فقہ اور تصوف میں بھی دسترس پائی۔ درویشانہ تعلیم نے روحانیت کو جلا بخشی گویا شاعری اور تصوف کی تعلیم ورثے میں ملی۔ آپ باعمل صوفی تھے۔ ''قال'' کے نہیں بلکہ ''حال'' کے صوفی تھے۔ ذاتی تقدس، تقویٰ، خودداری، ریاضت، عبادت، قناعت، حق پرستی اور درویشی کی وجہ سے، چھوٹے بڑے ان کی عزت کرتے تھے۔ یہی موضوعات اُن کی شاعری میں شامل ہیں۔

دردؔ کا اردو دیوان اگرچہ مختصر ہے مگر سراپا انتخاب ہے۔ دردؔ کے کلام کی شستگی، تاثر اور صفائی کے بارے میں مولانا محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں بہت مختصر مگر نہایت لطیف اور جامع تبصرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''درد کی غزل سات یا نو شعروں کی ہوتی ہے۔ خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں غزل کہتے ہیں گویا تلوار کو کی آب داری، نشتر میں بھر دیتے ہیں۔'' خیالات متین ہیں کسی کی ہجو کبھی اور نہ کسی دنیادار کا قصیدہ لکھا۔ ان کے کلام میں سوز و گداز، متانت، نفاست حلاوت اور رنگینی ہے۔ بقول امیر مینائی ''کلام کیا ہے پسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں۔''

1۔ غزل ـــــ خواجہ میر دردؔ

شعر 1:

کام مردوں کے جو ہیں، سو وہی کر جاتے ہیں
جان سے اپنی جو کوئی کہ گزر جاتے ہیں

مشکل الفاظ کے معانی: ○ **کام مردوں کے:** بہادروں کے کام، دلیری اور جوانمردی کے کام، مردوں سے یہاں مراد ہے بہادر لوگ۔

مفہوم: دنیا میں صرف وہی لوگ دلیری کے کام کر سکتے ہیں جو اپنی جان کی پروا نہیں کرتے۔

تشریح: خواجہ میر دردؔ غزل کے اس مطلع میں ایک اٹل اور مسلمہ حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی بھی بڑا کارنامہ انجام دینے کے لیے جرأت، مردانگی، بہادری، بلند ہمتی اور جوانمردی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جوانمرد جو کچھ کہتے ہیں اسے پورا کرتے ہیں۔ راستے کتنے ہی کٹھن، راہیں کتنی ہی دُشوار اور منزلیں کتنی ہی پُرخطر کیوں نہ ہوں وہ کسی خطرے کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ کڑی دُھوپ ہی کو اپنا سایہ بنا لیتے ہیں ہر گرداب کو پانیوں کا پھول سمجھتے ہیں۔ وہ کبھی قائداعظمؒ کی طرح، شاعر کے تصور کو حقیقت کا جامہ پہناتے ہیں اور کبھی وطن کی حفاظت کے لیے بم سینوں سے باندھ کر ٹینکوں کے آگے لیٹ جاتے ہیں۔ انہیں موت کی قطعاً پروا نہیں ہوتی۔

موت ان کے لیے محض ایک کھیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِن جوانمردوں کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے ناممکنات کو ممکن بنا دیا۔ ان کے کارنامے ابد تک یاد رکھے جائیں گے' جو لوگ جان کو اعلیٰ ترین مقاصد سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں انہیں جوانمرد نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ان کے ارادے بلند نہیں ہوتے اسی لیے وہ کسی ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں جرأت کا اظہار نہیں کر سکتے۔ بزدل لوگ کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتے۔ خواجہ میر درد ایسے لوگوں پر طنز بھی کر رہے ہیں اور انہیں عمل کی طرف راغب بھی کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ تاریخی کارنامے انجام دینا ''نشانِ حیدر'' پانا اور اپنا نام زندۂ جاوید رکھنا صرف ان لوگوں کا کام ہے جو کسی اعلیٰ مقصد کی خاطر مرنا جانتے ہیں۔ بقول اقبالؒ

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

شعر 2: **موت! کیا آ کے فقیروں سے تجھے لینا ہے**
مرنے سے آگے ہی' یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

مشکل الفاظ کے معانی: ○ **فقیر:** وہ لوگ جنہوں نے فقر اختیار کیا ہو۔ یہاں فقیر سے مراد صوفی اور درویش لوگ ہیں جو دنیا سے بے نیاز ہوں' جنہوں نے اپنی خواہشاتِ نفسانی کو مار ڈالا ہو' دنیا کی عشرتوں کو چھوڑ کر اصل موت سے پہلے ہی اپنے آپ کو مار ڈالا ہو ○ **موت سے آگے مرنا:** یعنی موت آنے سے پہلے مرنا۔ نفسِ امارہ کو مارنا۔ دنیاوی خواہشات کو مار ڈالنا۔

مفہوم: موت کو اِن لوگوں سے کیا ملے گا جنہوں نے مرنے سے پہلے ہی اپنے آپ کو مار ڈالا ہو اور خود موت کے منتظر ہوں۔

تشریح: خواجہ میر درد نے اس شعر میں لفظ ''فقیروں'' سے بڑی معنویت پیدا کی ہے ایک صوفی اور درویش جس نے اپنی تمام دنیاوی آرزوؤں' تمناؤں اور خواہشوں کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ تمام نفسیاتی لذتوں اور زندگی کی مسرتوں کو چھوڑ دیا ہے۔ اپنی دلی خواہشات کو مار ڈالا ہے' فقر اختیار کر لیا ہے۔ زندگی اور کائنات میں میسر وسائل کو ذاتی مفاد میں لانے کا عمل چھوڑ دیا ہے۔ ''وہ ''مُوتُو اقبلَ اَن تموتو'' یعنی مَر جاؤ اس سے پہلے کہ تمہیں موت آ جائے۔'' کی عملی تفسیر بن چکا ہے۔

جسمانی یا حیوانی ضروریات یا نفسِ امارہ ہماری روحانی زندگی کے لیے بہت نقصان دہ ہیں جن کی وجہ سے ہم غرور اور تکبر کرتے ہیں صوفیائے کرام اسی لیے نفسِ امارہ کو مارنے پر زور دیتے ہیں تا کہ خدا تعالیٰ کی محبت کے سوا کسی اور ہستی یا چیز کی محبت دِل میں پیدا نہ ہو۔ اسی کو موت سے آگے یعنی موت سے پہلے مرنا کہتے ہیں۔ ایسے فقیروں اور دُنیا سے بے نیاز لوگوں کے پاس موت کا فرشتہ آ کر کیا لے گا؟ کیونکہ وہ پہلے ہی موت کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ موت ان کے لیے خوشخبری کا پیغام

لانے کا سبب بنتی ہے۔ انہیں دنیا چھوڑنے کا کوئی غم نہیں ہوتا۔ دنیا چھوڑنے کا غم تو انہیں ہوتا ہے جو دنیا سے دل لگاتے ہیں۔ خواجہ میر درد کہتے ہیں کہ اے موت! دنیا سے بے نیاز لوگوں کے پاس آ کر تجھے کیا ملے گا؟ ان کے پاس آنا یا نہ آنا برابر ہے۔ کیونکہ یہ لوگ پہلے ہی دنیاوی اعتبار سے مُردوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں' جو لوگ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں زندگی بسر کر رہے ہوں موت انکا کیا بگاڑ لے گی؟

کیا سہل جی سے ہاتھ اُٹھا بیٹھتے ہیں لوگ — یہ عشق پیشگاں ہیں الٰہی کہاں کے لوگ؟
مجنوں و کوہکن نہ تلف عشق میں ہوئے — مرنے پہ جی ہی دیتے ہیں اس خاندان کے لوگ

شعر 3: دید وا دید جو ہو جائے' غنیمت سمجھو
جوں شرر' ورنہ ہم' اے اہلِ نظر' جاتے ہیں

مشکل الفاظ کے معانی: ○ دیدوادید: آمنا سامنا' ملاقات' دو آدمیوں کا ایک دوسرے کی ملاقات کو جانا۔
○ غنیمت: کافی ○ جوں: جیسے ○ شرر: چنگاری ○ اہلِ نظر: نظر والے' بصیرت رکھنے والے۔

مفہوم: اس مختصر سی زندگی میں جتنی ملاقات یا دیدار ہو جائے اسے غنیمت سمجھو ورنہ اے اہلِ نظر! ہم چنگاری کی طرح بہت جلد دنیا سے جانے والے ہیں۔

تشریح: اس دنیا میں کسی سے ملاقات ہو جائے۔ کوئی منظر سامنے آ جائے۔ کسی سے آمنا سامنا ہو جائے۔ کسی کا دیدار ہو جائے تو اسے کافی سمجھا جائے۔ کیونکہ ہمارا قیام اس دنیا میں ایک خاص مدت تک کے لیے ہے۔ ہر شخص کو موت کی آغوش میں جانا ہے۔ موت کسی شخص کو کب آ جائے کچھ نہیں کہا جا سکتا' جب موت آ جائے گی تو اس دُنیا کی طرف سے آنکھ بند ہو جائے گی۔ ہماری رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے گی تو ہمیں دوبارہ اس دنیا میں کسی پسندیدہ یا غیر پسندیدہ شخص یا منظر کو دیکھنے کی مہلت نہیں ملے گی۔ دُنیاوی زندگی کا باب بند ہو جائے گا۔ اس لیے زندگی کے دوران میں جو وقت ملتا ہے۔ اس وقت کو غنیمت جاننا چاہیے۔ زندگی ایک چنگاری کی طرح بہت مختصر ہے۔ چنگاری جو جلتی ہوئی لکڑی یا کوئلے سے چھٹک کر ایک لمحے سے بھی کم وقت کے لیے ایک لکیر سی بناتی ہوئی فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسان کی زندگی بھی بہت مختصر ہے۔ اسی مختصر سی زندگی میں جو کچھ نظر آتا ہے اسے غنیمت جانیں ورنہ مرنے کے بعد اس دُنیا کی کوئی چیز نظر نہیں آئے گی۔ خواجہ حیدر علی آتش کہتے ہیں:

فرصتِ زندگی بہت کم ہے
مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے

شعر 4: بے ہنر' دشمنِ اہلِ ہنر سے' آ کر
منہ پہ چڑھتے تو ہیں' پر جی سے اُتر جاتے ہیں

مشکل الفاظ کے معانی: ○ بے ہنر: ہنر نہ جاننے والے' کمال نہ رکھنے والے' فن سے ناواقف۔

○ دُشمنیٔ اہلِ ہنر: صاحبانِ ہنر سے دُشمنی ○ منہ پر چڑھنا: منہ لگنا' گستاخ ہونا' مقابلہ کرنا ○ جی سے اُترنا: نظروں سے گر جانا' قدر نہ رہنا' عزت نہ رہنا۔

مفہوم: ہنر نہ جاننے والے لوگ' ہنر مند لوگوں کے ساتھ دُشمنی کی بنا پر مقابلے پر اُترتے ہیں لیکن ذلیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔

تشریح: خواجہ میر دردؔ نے اس شعر میں بے ہنر اور اہلِ ہنر۔۔۔ چڑھنا اور اُترنا کے الفاظ استعمال کر کے صنعتِ تضاد سے کام لیا ہے۔ وہ ایک بہت لطیف بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ لوگ جو کسی فن میں پختہ نہیں ہوتے اپنی کم ظرفی کی وجہ سے پختہ کار فنکاروں کے مقابلے میں اُترتے ہیں تو بہت جلد منہ کی کھاتے ہیں اور ذلیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا مقصد اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرنا اور بڑے ہنر مند کو کمتر ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ وہ صرف حسد اور دُشمنی کی بنیاد پر مقابلے پر اُترتے ہیں۔ چونکہ وہ فن کے اسرار و رموز سے واقف نہیں ہوتے اس لیے خود ہی ذلیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مشاہدے کی بات ہے کہ کم علم لوگ جب کسی عالم سے بحث کرتے ہیں تو ذلت اُٹھاتے ہیں' کوئی ادنیٰ گویا کسی بڑے گلوکار کے مقابل آتا ہے تو رسوا ہوتا ہے۔ کسی بڑے کاریگر کے مقابلے میں کوئی کمتر ہنر مند آتا ہے تو کچھ بھی کمال نہیں دِکھا سکتا۔ بعض بد اصل اور کم ہنر مند لوگ یہ جان کر کہ کسی بڑی ہستی کے مقابل آئیں گے تو جلد مشہور ہو جائیں گے۔ دشمنی کرتے ہیں لیکن اعلیٰ کے مقابلے میں ادنیٰ کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی اسے ذلت ہی اُٹھانا پڑتی ہے۔ تاریخِ عالم گواہ ہے کہ اہلِ ہنر ہمیشہ کامیاب و کامران اور باعزت رہے لیکن بے ہنر یا کم ہنر مند لوگوں کو ان کے مقابل ذِلت و رسوائی ہی اُٹھانا پڑی۔ فن پہلوانی کے اسرار و رموز سے کم آشنا شخص کسی ماہر پہلوان کے مقابل اپنی گردن ہی تڑوائے گا۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی کرنے والوں کو دنیا اور آخرت میں ذلت اُٹھانے کے سوا کبھی کچھ نہ ملا۔ کم ظرف لوگوں کے بارے میں سودا کہتے ہیں:

ہنر سے دُور ہے یہ اصل کی خلقت کہ آئینہ!
ضمیر سنگ سے بنتا تو ہے جوہر نہیں ہوتا

شعر 5: ہم کسی راہ سے واقف نہیں' جوں نورِ نظر
رہنما تو ہی تو ہوتا ہے' جدھر جاتے ہیں

مشکل الفاظ کے معانی: ○ واقف: آشنا' جاننے والا ○ نورِ نظر: نورِ بصر' آنکھوں کی روشنی' بینائی' ○ رہنما: رہبر' راستہ دِکھانے والا۔

مفہوم: ہم اپنی بینائی کی طرح خودکوئی بھی راستہ نہیں جانتے اے خداوند! تو ہی ہمارا رہنما ہے۔

تشریح: خواجہ میر درد کہتے ہیں کہ ہماری آنکھیں صرف وہی کچھ دیکھتی ہیں جس طرف ان کا رُخ ہوتا ہے۔ یعنی آنکھوں کا نور صرف اسی چیز کو دیکھ سکتا ہے' جو اس کے سامنے لائی جائے یا جو مناظر ہمیں ہماری آنکھوں کی بینائی دکھاتی ہے' ہم صرف وہی دیکھتے ہیں لیکن جو کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں آتا ہم وہ چیزیں اور وہ مناظر نہیں دیکھ سکتے۔ خواجہ میر درد اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے اللہ! تیری رہنمائی کے بغیر ہم کچھ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم وہی کچھ کرتے ہیں جو تو چاہتا ہے۔ ہم اپنی مرضی کے مطابق کچھ نہیں کر سکتے۔ تیری مرضی کے بغیر کائنات کا کوئی ذرہ کوئی پتا بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ کوئی پرندہ پَر نہیں مار سکتا۔ کوئی شخص پلک نہیں جھپک سکتا۔ درد نے اس شعر میں دراصل نظریہ جبر کو موضوع بنایا ہے وہ خود باعمل صوفی تھے اور ''نظریہ جبر'' پر یقین رکھتے تھے۔ یہ وہ نظریہ ہے جس کے مطابق دُنیا میں خدا کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ صوفی حضرات گناہوں سے بچتے ہوئے جو کوئی بھی نیک عمل کرتے ہیں۔ اسے خدا ہی کی رضا جانتے ہیں اپنا عمل قرار نہیں دیتے۔ ہماری بینائی خود کسی راستے سے واقف نہیں ہے۔ ہماری نظر ہمیں نظر نہیں آتی کیونکہ وہ غیر مادی یا غیر مرئی ہے۔ اسی طرح خدا بھی غیر مادی اور غیر مرئی ہے۔ صوفیائے کرام خدا کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ حدیثِ مبارکہ کے مطابق

''جب کوئی بندہ اپنے ارادے اور اپنے عمل کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے تو اس کا کوئی عمل اس کا ذاتی عمل نہیں رہتا۔''

حضرت عیسیٰ جب قم باذن اللہ کہتے تو مردہ زندہ ہو جاتا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب کنکریاں دشمنوں کی طرف پھینکیں تو یہ کنکریاں خدا نے پھینکیں۔

''وَمَا رَمیت' اذ رمیت.''

جوں نورِ نظر تیرا تصور
تھا پیشِ نظر جدھر گئے ہم

شعر 6: **آہ معلوم نہیں' ساتھ سے اپنے شب و روز**
لوگ جاتے ہیں چلے' سو یہ کدھر جاتے ہیں

مشکل الفاظ کے معانی: ○ **آہ:** افسوس ○ **شب و روز:** رات دِن

مفہوم: افسوس ہمیں اس بات کا علم نہیں کہ ہمارے ساتھ جینے والے لوگ مرنے کے بعد ہمارا ساتھ چھوڑ کر کہاں چلے جاتے ہیں؟

تشریح: خواجہ میر درد نے اس شعر میں صنعت تضاد سے کام لیا ہے۔ شاعر نے سوال اُٹھایا ہے کہ فلسفی اور صوفی حضرات تو اپنی زندگیاں اسی سوال کا جواب ڈھونڈنے میں گزار دیتے ہیں لیکن اس کا جواب نہیں ملتا۔ مذہبی

نقطۂ نظر سے اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ مرنے کے بعد ہمیں عالمِ برزخ میں چلے جانا ہے اور انسان کی قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہوگی، پھر روزِ حشر آئے گا۔ انسانوں کے اعمال کے حساب کتاب کا مرحلہ ہوگا اس کے بعد جنت یا دوزخ میں جانا ہوگا اور انسان ہمیشہ اسی میں رہیں گے لیکن زندگی اور موت کی حقیقت پر غور کرنے والے فلسفی اور صوفی حضرات یا شاعرانہ طبیعت رکھنے والے حساس لوگ یہ سوچتے ضرور ہیں کہ دِن رات ہمارے ساتھ کھانے پینے' اُٹھنے بیٹھنے والے' کھیلنے کودنے والے' لڑنے جھگڑنے والے' پیار محبت کرنے والے' خوشی اور غم میں ساتھ دینے والے جب مر جاتے ہیں تو اِن کی رُوح کو جسم سے کیسے نکالا جاتا ہے۔ آدمی مرتا ہے تو آنکھیں رکھنے کے باوجود وہ دیکھ نہیں سکتا۔ پاؤں ہونے کے باوجود وہ چل نہیں سکتا۔ زبان ہونے کے باوجود بول نہیں سکتا۔ زندہ تھا تو بھوک بھی لگتی تھی' پیاس بھی ستاتی تھی۔ رُوح نکل گئی ہے تو اب اس کے کھانے پینے کا کیا سلسلہ ہے؟ اگرچہ یہاں بھی اسلام اور اللہ کے رسول نے ہماری رہنمائی فرمائی ہے لیکن عام انسان ہونے کی وجہ سے اِن سوالوں کا جواب جاننے کی طلب باقی رہتی ہے۔ خواجہ میر دردؔ کے انجان بن کر سوال کرنے کا انداز بڑا خوبصورت ہے کہ مرنے والوں کے ساتھ مرنے کے بعد کیا سلوک ہوتا ہے۔ خواجہ میر دردؔ کا اس مضمون کا ایک اور شعر یہ ہے:

دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے، کیدھر چلے؟

شعر 7: تا قیامت نہیں مٹنے کا دِل عالم سے
دردؔ ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں

مشکل الفاظ کے معانی: ○ **تا قیامت**: قیامت تک ○ **دل عالم سے**: دنیا والوں کے دِل سے
○ **عوض**: بدلے میں' جگہ بدلنے کے طور پر۔

مفہوم: عظیم فنکار اگرچہ مر جاتے ہیں لیکن ان کا فن انہیں ہمیشہ زندہ رکھتا ہے۔

تشریح: شاعر' عام طور پر ''شاعرانہ تعلّی'' سے کام لیتے ہیں یعنی اپنی شاعری کی عظمت کا دعویٰ کرتے رہتے ہیں۔ خواجہ میر دردؔ نے غزل کے اس مقطع میں اپنے کلام کے یا اپنے تصوف کی تعلیم کے قیامت تک باقی رہنے کا ذکر کیا ہے۔ انہیں اپنے کلام کے بارے میں احساس ہے کہ اس کلام نے فنونِ لطیفہ کے مقاصد پورے کیے ہیں۔ اگر شاعری کا مقصد مسرت بہم پہنچانا ہے تو خواجہ میر دردؔ کی شاعری دُنیا کی بے ثباتی کے بارے ہی میں نہیں بتاتی بلکہ شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ زندگی کی ترجمانی بھی کرتی ہے' جس سے مسرت اور لطف پیدا ہوتا ہے۔ اگر فنونِ لطیفہ اور ان میں سے شاعری کا مقصد انسانیت کی فلاح و بہبود ہے اور انسان کو زندگی کے کسی اعلیٰ مفہوم سے آگاہ کرنا ہے تو خواجہ میر دردؔ کی صوفیانہ شاعری نے انسانوں کو خدا کی ذات سے صرف روشناس

کروانے کا کام ہی نہیں کیا بلکہ خدا اور اس کے رسول سے محبت کا درس بھی دیا ہے۔ اِن کے خلوص نے کلام میں بڑا اثر پیدا کیا ہے۔

دردؔ اسی اثر کے بارے میں کہتے ہیں کہ میں خود تو دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں لیکن اپنے بدلے میں اپنے کلام کا اثر دنیا میں چھوڑے جا رہا ہوں' جو میرے مرنے کے بعد بھی لوگوں کے دِلوں سے مٹ نہ سکے گا۔ لوگ قیامت تک میرے کلام کی خصوصیات' اس کی خوبیوں' رعنائیوں اور لطافتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے اور تصوف میں رہنمائی حاصل کریں گے اگرچہ میرا فانی جسم مٹ جائے گا لیکن میرے کلام کی اثر آفرینی مجھے لوگوں میں زندہ رکھے گی۔ دردؔ کے کلام کا جائزہ لیں تو غزل کے اِس مقطع کو شاعرانہ تعلّی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اِن کا کلام آج بھی وہی اثر رکھتا ہے جو اِن کی زندگی میں تھا۔ ان کی موت کے بعد ہزاروں انقلاباتِ زمانہ نے لوگوں کے بڑے بڑے فن پاروں کا وجود مٹا دیا۔ اپنے دَور کے شہ پارے کوڑیوں کے مول بک گئے لیکن دردؔ کا مختصر سا دیوان آج بھی ہر دردمند دِل کا ترجمان نظر آتا ہے۔ یہ اِن کے کلام کی اثر آفرینی کی زندہ مثال ہے۔

یہ اثر صرف شاعری ہی میں نہیں ہوتا بلکہ فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے ہر بڑے کارنامے میں موجود ہوتا ہے۔ صادقین کی خطاطی ہو یا تاج محل آگرہ۔ سپین میں مسجد قرطبہ ہو' شیکسپیئر کے ڈرامے ہوں یا حسان بن ثابت کی نعت گوئی' شیخ سعدی اور مولانا روم کی اخلاقی فارسی شاعری ہو یا میر تقی میرؔ' مرزا غالبؔ' میر انیسؔ' علامہ اقبال کی شاعری، ان تمام شہ پاروں کی تاثیر میں آج بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ کیونکہ ان تخلیق کاروں نے اپنے کام اور کلام کو عشق کی قوت سے لافانی بنا دیا ہے۔

دردؔ نے غزل کے اس مقطع میں اپنے تخلص کا ذو معنی استعمال کیا ہے' جس طرح کوئی دردؔ پیدا ہو کر ختم بھی ہو جائے۔ تو اس کا اثر دیر تک باقی رہتا ہے۔ اسی طرح دردؔ کے کلام میں تصوف کی اخلاقی اور اسلامی تعلیم کی وجہ سے قیامت تک اس کا اثر دِلوں میں موجود رہے گا۔ اس مقطع میں اثر سے مراد میر دردؔ کے چھوٹے بھائی میر اثرؔ بھی ہیں' جو دردؔ کے بعد ان کے جانشین مقرر ہوئے اور دردؔ کو توقع تھی کہ رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا۔ میر اثرؔ' دردؔ کی طرح صوفی باعمل بھی تھے اور شاعر بھی۔

2۔ غزل ـــــ خواجہ میر دردؔ

شعر 1:

کیا فرق داغ و گُل میں کہ' جس گُل میں بُو نہ ہو
کس کام کا وہ دِل ہے کہ' جس دِل میں تُو نہ ہو

مفہوم: جس پھول میں خوشبو نہ ہو وہ صرف ایک داغ ہے۔ اسی طرح جس دل میں اللہ تعالیٰ کی ذات نہ ہو، وہ دِل بیکار ہے۔ گوشت کا لوتھڑا تو ہے' دِل نہیں۔

تشریح: خواجہ میر دردؔ غزل کے اِس مطلع میں گُل اور اِس کی خوشبو سے تعلق کا ذِکر کر کے انسانی دِل کی خوشبو اللہ تعالیٰ کو قرار دیتے ہیں' جس طرح کسی پھول میں خوشبو نہ ہو تو وہ صرف ایک نشان یا داغ ہی تو ہے' پھول ہرگز نہیں